جے ایم کوٹسی

وحشیوں کا انتظار

انگریزی سے ترجمہ:

صدیق عالم

جے ایم کوٹسی

وحشیوں کا انتظار

(ناول)

انگریزی سے ترجمہ:

صدیق عالم

انتساب

یہ ترجمہ برصغیر کے ان ہزاروں کرنل جول کے نام ہے جو اپنے سیاسی آقاؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے قانون کی آڑ میں معصوم زندگیاں کچلتے رہتے ہیں۔

صدیق عالم

تعارف

جنوبی افریقہ کے معروف ادیب جے ایم کوٹسی (John Maxwell Coetzee) 1940میں کیپ ٹاؤن میں افریکانیر (Afrikaner) والدین کے گھرپیدا ہوے-آنرز تک تعلیم کیپ ٹاؤن یونیورسٹی میں حاصل کی اور یونیورسٹی آف ٹیکسس، آسٹن سے ادب اور لسانیات میں پی ایچ ڈی کیا- کچھ عرصہ امریکہ میں پڑھانے کے بعد وہ کیپ ٹاؤن یونیورسٹی سے متعلق رہے- 2002 میں وہ آسٹریلیا منتقل ہو گئے اور اب ایڈیلیڈ شہر میں رہتے ہیں-

جے ایم کوٹسی ناول نگار کے علاوہ مضمون نگار،مترجم اور ماہر لسانیات بھی ہیں- فکشن لکھنا انھوں نے 1969 میں شروع کیا اور ان کے دو ناول *Dusklands* اور *In the Heart of the Country* بالترتیب 1974 اور 1977میں شائع ہوے، لیکن ان کو بین الاقوامی شہرت زیرنظر ناول *Waiting for the Barbarians* سے حاصل ہوئی جو 1980 میں شائع ہوا-ان کے دو ناولوں *Life and Times of Michael K* اور *Disgrace* کو بوکر پرائز دیا گیا- ان کو 2003 میں ادب کا نوبیل انعام دیا گیا-

وحشیوں کا انتظار نوآبادیاتی تسلط اور ظلم و ستم کےموضوعات کی کھوج کرنے والا ایک نہایت طاقتور بیانیہ ہے اور جدید حساس فکشن کی انتہائی بلندیوں کو چھو لیتا ہے- اس کا ترجمہ اردو کے منفرد فکشن نگار صدیق عالم نے نہایت خوبی سے کیا ہے-

اس سے پہلے میں نے کبھی ایسی چیز نہیں دیکھی تھی: تار کے حلقوں میں پھنسی کانچ کی دو چھوٹی ٹکیاں جو اس کی آنکھوں کے سامنے معلّق ہیں۔ کیا وہ اندھا ہے؟میں اسے سمجھ پاتا اگر اس نے اپنے اندھےپن کو چھپانے کی کوشش کی ہوتی۔ لیکن وہ اندھا نہیں ہے۔ ٹکیاں تاریک ہیں، وہ باہر سے دھندلی نظر آتی ہیں مگر اندر سے وہ چیزوں کو دیکھ سکتا ہے۔ وہ مجھے بتاتا ہے کہ یہ ایک نئی ایجاد ہے۔ ''یہ دھوپ کی چکاچوند سے آنکھوں کو بچاتی ہیں،'' وہ کہتا ہے۔ ''یہاں ریگستان میں آپ انھیں بہت کام کی چیز پائیں گے۔ ان کے ہوتے آپ کو آنکھیں موندے رکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ سر کا درد بھی بہت کم ہو جاتا ہے۔ دیکھیے۔'' وہ اپنی آنکھوں کے کونوں کو ہلکے سے دباتا ہے۔ ''کہیں پر جھریاں نہیں ہیں۔'' وہ عینک اتار دیتا ہے۔ یہ سچ ہے۔ اس کی جلد کسی جوان آدمی کی جلد کی طرح تروتازہ ہے۔ ''گھر پر سب لوگ اسے پہنتے ہیں۔''

ہم سرائے کے سب سے عمدہ کمرے میں بیٹھے ہیں۔ ہمارے درمیان ایک فلاسک رکھا ہے اور بادام سے بھرا ایک کٹورا۔ اس کے وہاں ہونے کے اسباب کیا ہیں، ہم اس پر گفتگو نہیں کرتے۔ اتنا کہنا کافی ہے کہ اسے یہاں ہنگامی اختیارات حاصل ہیں۔ ہم اپنی گفتگو کا رخ شکار کی طرف موڑ دیتے ہیں۔ وہ مجھے اس آخری ہانکے کے بارے میں بتاتا ہے جس میں وہ اپنے گھوڑے پر سوار تھا۔ اس مہم کے دوران ہزاروں کی تعداد میں ہرن، خنزیراور بھالو موت کے گھاٹ اتار دیے گئے تھے، اتنی تعداد میں کہ ان کے مردہ جسموں کا پہاڑ لگ گیا تھا۔ (کتنے افسوس کی بات ہے نا!) میں اسے ہنسوں اور مرغابیوں کے جھنڈ کے بارے میں

بتاتا ہوں جو ہر سال اپنی ہجرت کے دوران جھیل پر اترتے ہیں اور یہ بھی کہ کس طرح مقامی باشندے انھیں پھندا ڈال کر پکڑتے ہیں۔ میں نے اسے رات کے وقت مچھلی کے شکار کے لیے اپنے ساتھ ایک دیسی ناؤ پر چلنے کی تجویز پیش کی۔ ''یہ ایک ایسا تجربہ ہے جسے آپ کھو نہیں سکتے،'' میں کہتا ہوں۔ ''مچھیرے دہکتی مشعلوں کے ساتھ ہوتے ہیں، وہ پانی پر ڈھول پیٹتے ہیں تاکہ مچھلیوں کو ہنکاتے ہوے ان کے لگائے گئے جالوں کی سمت لے جا سکیں۔'' وہ سر ہلاتا ہے۔ وہ مجھے اپنے ایک سفر کے بارے میں بتاتا ہے جب اسے سرحد پر کسی جگہ جانا پڑا تھا جہاں لوگ ایک خاص قسم کا سانپ بڑی رغبت سے کھایا کرتے ہیں۔ اس نے ایک بہت بڑے چکارے کا بھی ذکر کیا جسے اس نے گولی کا نشانہ بنایا تھا۔

وہ عجیب و غریب فرنیچر کے درمیان اپنا راستہ بنا رہا ہے مگر اپنی سیاہ عینک نہیں اتارتا۔ وہ جلد بستر پر جانے کا عادی ہے۔ اس نے اپنے قیام کے لیے اس سرائے کو چنا ہے کیونکہ شہر میں اس سے بہتر کوئی دوسری جگہ نہیں۔ میں نے اپنے عملے پر یہ واضح کر دیا ہے کہ وہ ایک اہم مہمان ہے۔ ''کرنل جول تیسرے بیورو سے ہیں،'' میں انھیں بتاتا ہوں۔ ''تیسرا بیورو ان دنوں سول گارڈ کا اہم ترین ڈویژن ہے۔'' ان افواہوں سے جو کافی عرصے بعد راجدھانی سے اُڑتی پُڑتی ہم تک پہنچتی ہیں، ہم نے یہی سنا ہے۔ سرائے کا مالک اثبات میں سر ہلاتا ہے۔ نوکرانیاں اپنے سروں کو جھکا لیتی ہیں۔ ''ہمیں چاہیے کہ ہم ان پر اچھا تاثر قائم کریں۔''

میں سونے کے لیے اپنی چٹائی فصیل کے اوپر لے جاتا ہوں جہاں گرمی سے رات کے وقت چلنے والی ہواؤں کے سبب تھوڑی راحت ملتی ہے۔ چاند کی روشنی میں شہر کی سپاٹ چھتوں پر لوگ سوتے نظر آ رہے ہیں۔ چوک پر کھڑے اخروٹ کے درخت کے نیچے ہونے والی گفتگو کی بازگشت یہاں تک سنائی پڑ رہی ہے۔ اندھیرے میں ایک پائپ جگنو کی طرح چمک اٹھتا ہے، مدھم ہو جاتا ہے، پھر سے چمک اٹھتا ہے۔ گرمی دھیرے دھیرے اپنے خاتمے پر ہے۔ باغ میں پیڑ پودے اپنے بوجھ سے جھکے جا رہے ہیں۔ اپنے جوانی کے دنوں سے میں نے راجدھانی کو نہیں دیکھا ہے۔

تڑکا ہونے سے پہلے میں جاگ جاتا ہوں اور سوتے سپاہیوں کے درمیان دبے پاؤں چلتے ہوے زینے پر پہنچ جاتا ہوں۔ سپاہیوں کے جسموں میں اب حرکت پیدا ہونے لگی ہے۔ وہ اپنی ماؤں اور محبوباؤں کو خواب میں دیکھتے ہوے لمبی لمبی سانسیں بھر رہے ہیں۔ آسمان سے ہزاروں ستارے ہماری طرف تاک رہے ہیں۔ سچ کہا جائے تو ہم دنیا کی چھت پر ہیں۔ رات کے وقت اگر کھلے میں آنکھ کھل جائے تو کسی کا بھی ہکابکا ہو جانا فطری ہے۔

پھاٹک پر بیٹھا سنتری بندوق کو اپنی گود میں ڈالے، ٹانگوں کو ایک دوسرے پر چڑھائے، گہری نیند سو رہا ہے۔ حمّال کا کمرہ بند ہے۔ اس کی ٹرالی باہر کھڑی ہے۔ میں گزر جاتا ہوں۔

’’قیدیوں کے لیے ہمارے پاس کوئی انتظام نہیں ہے،‘‘ میں وضاحت پیش کرتا ہوں۔ ’’یہاں جرائم کا ارتکاب برائے نام ہے اور سزا کے نام پر جرمانے کا رواج